وارث از قلم زینب بنت زمان

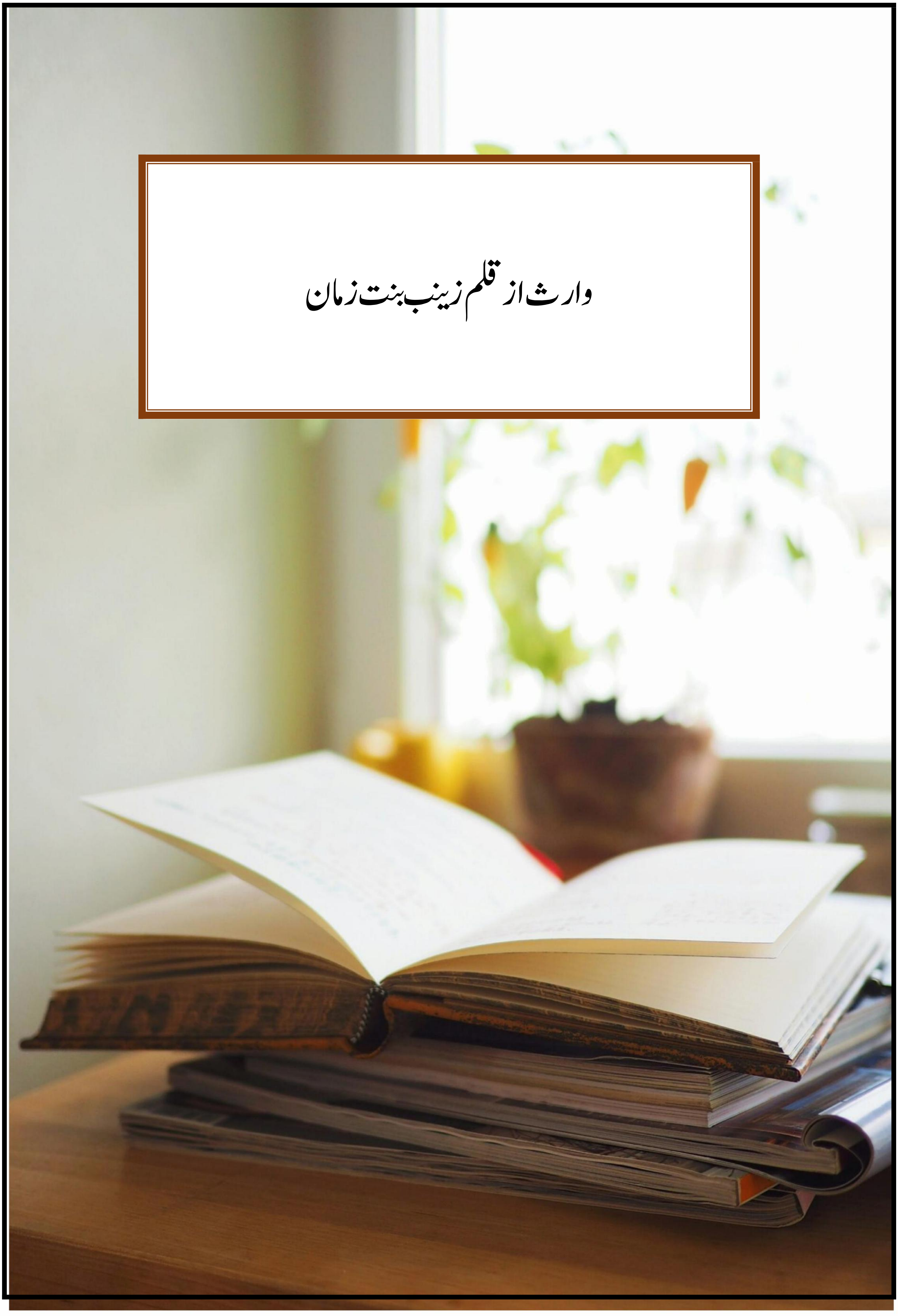

اردو ناولز بلاگز

اردو ناولز بلاگز کی طرف سے پیشکش

ناول "اردو ناولز بلاگز" کی ویب سائٹ کا حصہ ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا گیا ہے ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے
آپ کو اعلیٰ معیار اور اردو ادب فراہم کیا جائے۔
براہ کرم اس pdf کو صرف ذاتی مطالعے کے لیے استعمال کریں اس کے بغیر اجازت تقسیم، کاپی یا کسی اور پلیٹ فارم پر
اپلوڈ کرنا سختی سے منع ہے۔
اگر آپ ہمارے ساتھ اپنی تحریریں شیئر کرنا چاہتے ہیں یا کوئی تجاویز دینا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔:

urdunovelsblog

ویب سائٹ: urdunovels.blogs

ای میل: urdunovelsblogs@gmail.com

انسٹاگرام: @urdunovelsblogs

فیس بک: fb.com/urdunovelsblogs

آپ کی رائے ہمارے لیے اہم ہے!

وارث از قلم زینب بنت زمان

اب یونہی گزرے کی زندگی
پچھتاوے کے جال میں لپٹے
کبھی نم آنکھیں صاف کرتے
وہی پرانی اذیتیں یاد کرتے
اڈھیرتے ہوئے دل کے داگے
یونہی صبح کو رات کرتے
وراثتوں کے معاملے زہریلے
عملی سبھی مکافات کرتے
زمین کے ٹکڑوں کی چاہ میں
اپنی ہی جیت کو مات کرتے
اب یونہی گزرے کی زندگی
پچھتاوے کے جال میں لپٹے
کبھی نم آنکھیں صاف کرتے
وہی پرانی اذیتیں یاد کرتے

مرتی ہوئی رات کے اندھیرے سے پھوٹتی ایک روشنی کی کرن نے دن کے چڑھنے کا امکان مکمل کر دیا۔پرہیزگاروں نے سجدوں سے سر اٹھا دیے وہ اپنا اور اپنے رب کا تعلق رات کے سجدوں میں نم آنکھوں سے گہرا کرتے تھے۔اور گناہ گاروں نے اپنے گناہوں کا سلسلہ مدم کر دیا ان کے مطابق رات کا اندھیرا ان کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے۔اور خوش فہمیوں سمیت اس سوچ کا بھی علاج نہیں۔

رات نے دم توڑتے روشنی کو تمام عالم کی ذمہ داری سونپی تو اہل دنیا نے بھی دن کی روشنی میں اپنے اپنے کاموں کی فہرست کو مکمل کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ہواؤں نے انسانوں کی رفتار دیکھی جو دن چڑھتے اتنی جلدی میں اپنے منزلوں کی طرف رخ کر گئے کہ یوں لگتا تھا کہ ،انسانوں کے لیے سب سے ضروری عمل یہی ہو۔اور واقعتاً انسان کے لیے اب دنیا میں رزق کا کونسیپٹ سب سے اول درجے پہ جا پہنچا ہے۔

رزق،زمین،جائداد،عیش،عشرت،سکون،طاقت،حکمرانی سب کا سب انسان کے ذہن میں پہلے نمبر پر ہے کہ یہ سب ہو گا تو وہ جی سکے گا اچھی زندگی،بہترین زندگی۔انسان دن کے طلوع ہونے اور رات کے چھا جانے کے بعد تک اپنے ایک ہی فعل میں لگا ہوا ہے۔اپنے نفس کہ اطاعت میں۔

مگر ہیں کچھ ایسے وجود جو اس نفس کے سائیکل سے نکل آئے ہیں اور اب پچھتاوے کی دلدل میں جا پھنسے ہیں۔ کہ وہ جتنے عرصے تک نفس کی سائیکل کا حصہ رہے وہ عرصہ اس لیے نہیں تھا وہ نفس کے لیے نہیں تھا۔ وہ مقصد کی پہچان اور تلاش کے لیے تھا مگر وہ گزارا گیا بغیر کسی مقصد کے، تو اب پچھتاوے کی گہری دلدل، اتنی گہری کہ نکلنا ممکن نہیں، اس پر یہ کہ کسی تنکے کا سہارا بھی میسر نہیں۔

آسمان پر بادلوں کی محفل عروج پر تھی۔ سورج کو اپنے پیچھے چھپائے بادل زمیں والوں اور سورج کے درمیان ایک پردے کی طرح حائل ہوئے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہے ہوں سورج تم کچھ آرام کرو زمین والوں کو بس دن کی روشنی میں ہی رہنے دو اپنی کرنوں کو کچھ پل سنبھال رکھو۔

یونہی زمین پر اس اولڈ ایج ہوم کے کونے پر بینچ پر بیٹھا وہ وجود ایسے تھا کہ کسی پتھر کی مورت ہو یاں پھر اس میں اور احساسات کے عین درمیان میں بھی کوئی پردہ حائل ہو۔ پچھتاوے کا پردہ، کاش کا پردہ۔ جس نے اس کی تمام حسوں کو ساکت کر دیا ہو اور وہ پتھر بن گیا ہو۔ جو سٹل ہو گیا ہے نہ پچھلا وقت بھلا سکتا ہے نہ ہی اگلے وقت کو جینا چاہتا ہے۔

بینچ کی عین پیچھے جھکے ہوئے بزرگ نیم کے درخت کی جھکی ہوئی شاخیں اوپر سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نیچے بنے بینچ پر بیٹھے وجود کا چہرہ تکنے کی تگ ودو میں ہوا کے دوش پر مزید جھکے جا رہی تھیں۔ یہاں وہاں پھرتی ہوا جھومتے ہوئے شاخ کے پتوں سے ٹکرائے کہنے لگی

" کیوں جھک رہی ہو شاخ اس کا چہرہ مت تلاش کرو، وہ تو چہرہ جھکا کر بیٹھا ہے، جیسے کوئی ندامت میں جھکاتا ہے، یاں جیسے دھتکارا ہوا چہرہ جھکتا ہے"

شاخ نے جھک کر اس وجود کا چہرہ دیکھنے کی خواہش کو دبا دیا۔ ہوا نے شاخ کو تو سمجھا دیا مگر خود تجسس کے مارے اس چہرے سے جا ٹکرائی اور حیران رہ گئی کہ اس وجود کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ اور وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ کسی گہری اور دل کے قریب یاد میں محو تھا۔

مگر یکدم اس وجود نے چہرہ اٹھایا اور شاخ بے جان لگنے لگی اور ہوا بھی بس ادھر سے ادھر پھرنے لگی۔

اس وجود کی بوڑھی آنکھوں میں کچھ تھا۔ نا سمجھ میں آنے والا۔ اس وجود نے اپنے دائیں جانب سے بچے کے کھلکھلانے کی آواز سنی اور چہرہ اس جانب موڑ لیا۔

اس منظر میں بچہ کھلکھلاتا ہوا اپنے باپ کے آگے آگے چلتا مستی میں کچھ کہہ رہا تھا اچانک پیر مڑنے کے باعث بچہ زمین پر جا گرا اور خو بخود بوڑھی آنکھوں میں فکر کا تاثر ابھرا اور بچے کو تھامنے کے لیے ہاتھ آگے بڑا مگر بچے کا باپ اسے زمین سے اٹھا چکا تھا، اس کا باپ اسے سنبھال چکا تھا اور خفگی اور فکر کے تاثرات سے کچھ کہہ رہا تھا، صاف تھا اسے سیدھا چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ بزرگ کا ہاتھ واپس ڈھے گیا۔ یکدم منظر صاف ہو گیا۔

اب وہاں کوئی کھلکھلاتا ہوا بچہ تھا نہ اس کا باپ۔ اس سے پہلے کہ بوڑھی آنکھیں حال کے منظر میں لوٹتیں منظر پھر تبدیل ہوا۔ بوڑھے وجود نے دیکھا اس کے عین سامنے وہی شخص کرسی پر جھول رہا تھا اور اس کے سینے پر وہی بچہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ لیے اپنے باپ کے چہرے پر ہاتھ میں پکڑے رنگوں سے نقش و نگار بنا رہا تھا۔

بزرگ کے بائیں جانب ایک اور منظر ابھرا۔ باپ نے بچے کی آنکھ پر پٹی باندھ رکھی تھی اور اسے لیے سامنے موجود تحفے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مقرر مقام پر پہنچ کر آدمی نے بچے کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی تو بچے نے دونوں ہاتھ آپس میں ملاتے ہنستے ہوئے ایک بار مڑ کر باپ کو دیکھا اور دوسری بار سامنے موجود کالے اور براون رنگ کے پپی کو۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، چہرہ خوشی سے لال ٹمٹماتا ہوا خوبصورت نظارہ بنا ہوا تھا۔

منظر تبدیل ہوا خوشیوں میں رنگے چہرے دونوں آدمی اور بچہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی آئس کریم کھلا رہے تھے۔ بچے نے اپنی آئس کریم باپ کی جانب بڑھائی تو ہاتھ ڈگمگانے سے وہ باپ کے کپڑوں پر گر گئی۔ دونوں کی نظر بیک وقت آئس کریم سے خراب کپڑوں پر پڑی، بچے نے حراساں نظروں سے باپ کو دیکھا۔ مگر اس آدمی نے کپڑے پر گری آئس کریم پر انگلی پھیر کر بچے کے گال پر رگڑ دی، اور اسے اپنی آئس کریم تھما کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

منظر دندھلے ہو گئے۔ بزرگ کی آنکھوں سے انمول پانی بہتا ہوا گال کے ذریعے گھٹنے پر دھرے ہاتھ پر جا گرا۔

بزرگ نے چونک کر حال کو منظر دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ کئی زمانوں کا سفر کر آئے ہوں۔ تھکاوٹ زدہ چہرہ سامنے اٹھا تو سامنے سے نظر آتے روڈ کے منظر پر لوگ اپنے آپ میں مگن نظر آ رہے تھے۔ سبھی خود سے الجھے مصنوعی برتاو کر رہے تھے۔

بادلوں کی اوٹ میں چھپا سورج اب ہلکی ہلکی جھلک دکھانے لگا تھا۔ بادلوں کا پردہ آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

بینچ کے کچھ فاصلے پر چار چھ سیڑھیوں کے اوپر ایک ٹیرس نما جگہ تھی۔ جہاں صادق حمید بیٹھے قرآن کی تلاوت سے دل منور کر رہے تھے۔ انہیں یہاں اس اولڈ ہوم آئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹھے نے ابروڈ کی زندگی جینے کی خواہش میں اپنے وطن کو تو چھوڑا ہی چھوڑا ساتھ اپنے باپ کو بھی بھول گیا۔ مگر وہ نہیں بھولا تو جائیداد کو نہیں بھولا۔ صادق حمید کی عمر بھر کی کمائی ان کے بیٹے نے اپنی خواہش کے لیے صرف کر دی اور بیرون ملک جا پہنچا۔

عمر کی آواز پر صادق صاحب نے اسے دیکھا اور قرآن کو لحاف میں لپیٹتے اس سے پوچھنے لگے

صادق حمید نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا " کیا بات ہے برخردار! کیوں گھور گھور کر اس گملے کو دیکھ رہے۔ یوں لگ رہا ہے سالم نگلنے کا ارادہ رکھتے ہو "

چھوٹے سے عمر کی دہائی بڑی تھی۔ بس ماتھے سے " دیکھیں انکل میں نے اتنے دنوں پہلے اس میں بیج بویا تھا۔ اور یہ ابھی تک اگا نہیں ہے۔ میرا تو انتظار سے برا حال ہے" پسینہ پونچھنا باقی رہ گیا تھا ورنہ تو انتظار کی تھکاوٹ بہت زیادہ تھی۔

"صرف بیج بونے سے پھول نہیں نکلا کرتے ان کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ صبر کے ساتھ محنت بھی ضروری ہے، لازم ہے۔ کیا اسے پانی دیتے ہو تم؟"

اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس کرتے ہوئے پوچھا۔

urdunovelsblog

ان کے انداز میں نرمی سمیٹ کچھ اور بھی تھا۔ شاید محبت، یاں شاید باپ والی بے پناہ محبت۔

" ہاں میں دیتاہوں ناپانی"

" کب"

" جب یاد آجائے۔"

" یہی تو بات ہے۔ بیج تمہارے یاد آنے پر پانی دینے سے نہیں اگے گا "

"پھر"

اس کے بال انگلیوں سے سلجھائے "تمہارے اسے نا بھولنے سے،اس کی آبیاری وقت پر کرنے سے اور"

تجسس کو زبان ملی "اور"

" اور اس کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرنے سے"

وقفہ لے کر بتایا
وہ ہنس پڑا،وہ زور سے ہنس پڑا جیسے صادق حمید نے کوئی مذاق کیاہو۔ ہنسنے والا مذاق "باتیں اور وہ بھی بیج سے"

پھر مدعا دہرایا " ہاں بیج سے باتیں"

"بھلا بیج بھی سنتے ہیں؟"

اس کا انداز ایسا تھا کہ کوئی انہونی بات سنی ہو جیسے۔

" ہاں۔۔۔۔۔۔ سنتے بھی ہیں اور محسوس بھی کرتے ہیں، جانتے ہو کیسے؟ "
لہجہ ایسا تھا کہ لگتا تھا کسی تجسس زدہ کہانی کے پہلو سنائے جا رہے ہوں جیسے۔

اور تجسس اپنی جگہ بنا چکا تھا "کیسے"

" تم ان سے باتیں کر کے دیکھو وہ جلدی اگیں گے، تمہارے لہجے کا درد، چہچہاہٹ سب محسوس کریں گے۔ اور جواب بھی دیں گے۔۔ "

صادق حمید نے کہہ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے یقین تھیں جیسے کہتی ہوں لو بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کیا؟۔ اور آنکھوں کے سوا باقی چہرہ کو جھنے کے تاثرات میں تھا یعنی آنکھیں کہیں کہ یقین نہیں، چہرہ کہے دلائل دو۔

تم کھلے ہوئے پھولوں کے پاس بیٹھ کر امید اور خوشی کے مضمون پڑھو، اس سے اچھی باتیں کر و وہ مزید خوشبو بکھیر کر، مزید کھل کر تمہاری باتوں کا جواب دے گا۔ وہ " " بتائے گا کہ سنو عمر میں سن رہا ہوں۔

اور اگر غم شئیر کرو گے تو وہ تب بھی جواب دے گا۔ وہ مرجھانے لگے گا۔ تمہارا غم اور درد اسے مرجھا دے گا۔ پھول انسانوں جیسے نہیں ہوتے۔ ہم غم میں کوئی اور امید " وہ رک چند لمحے سانس لینے کو، یاں پھر کچھ یاد کرنے کو۔ " ڈھونڈ لیتے ہیں یاں پھر کوستے ہیں، واویلا مچاتے ہیں۔ مگر پھول۔۔

عمر کو کہانی میں مزہ آنے لگا تھا۔

" پھول یاں تو مزید کھل جاتے ہیں یاں مرجھا جاتے ہیں بس۔۔۔۔۔۔ تیسرا کوئی آپشن نہیں ہوتا۔۔ "

اس کو اب اپنا کرنے والا کام جاننا تھا۔ " میں کیا کروں اب؟ "

" پہلے پانی دو اس بیج کو پھر چند پہر اس سے باتیں کرو۔۔۔ اچھی اچھی باتیں "

اس نے سر ہلایا اور پانی لانے کے لیے مڑنے لگا "ہوں "

"اور ہاں اب محنت کرو گے تو صبر بھی کرنا۔ آج ہی پانی دینے سے آج ہی پھول نہیں اگیں گے، پہلے شاخ۔۔۔۔۔۔ پھر پتے۔۔۔۔۔۔ پھر کہیں جا کر پھول "

گردن موڑ کر بات سنتے عمر نے گردن سمجھے والے انداز میں ہلائی اور چل پڑا
آبیاری کا ساز و سامان لینے۔

صادق حمید نے اس کے جانے کے بعد سامنے کچھ فاصلے پر بنے بینچ پر نظر ڈالی، وہ آج بھی وہیں تھے۔ جب سے صادق حمید اس اولڈ ہوم آئے تھے ہر صبح انہیں وہیں بیٹھے دیکھا تھا۔ کبھی خالی ہاتھ تو کبھی چند کاغذوں میں مصروف۔

صادق حمید نے بزرگ خاتون کے بالوں کو سنوارتی صائمہ سے پوچھا۔ صائمہ اولڈ ہوم کی مالک اور عمر کی ماں تھی۔ اس کا شوہر بھی یہی تھا۔ مگر اولڈ ہوم وہی سنبھالتی تھی۔ دل و جان سے۔

اشارہ بینچ والے کی سمت تھا۔ " وہ کون ہیں"

" وہ۔۔۔وہ جنید انکل ہیں "

" مجھے لگتا ہے کہ وہ رو رہے ہیں "

وہ پہلے سے ہی جانتی تھی شاید " ہاں وہ رو رہے ہیں "

حیرت سے پوچھا " کیوں "

وجہ نہیں معلوم تھی " وہ بہتر جانتے ہوں گے "

urdunovelsblog

ارادہ ظاہر کیا " میں پوچھتا ہوں "

" پوچھ لیں۔ آپ کو بھی وہی جواب دیں گے جو سب کو دیتے آ رہے ہیں "

خاتون کے بالوں کی چٹھیا گوندتے پہلے ہی آگاہی دی

۔

اٹھتے قدم روک کر پوچھا "کیا "

چٹھیا کے آخر پر پونی لگاتے کہا۔ " کہیں گے میں کب روتا ہوں۔ کچھ یادیں آنکھیں بھگو دیتی ہیں "

"ہوں "

صادق حمید نے قدم اس کونے کی طرف بڑھادیے۔ جو کسی مصور کی ایسی پینٹنگ سے میل کھاتا تھا جس میں خوبصورتی بھی تھی اور اداسی بھی۔
اور اکثر مصوروں کے ایسے شاہکار آنکھیں بیک وقت حیران بھی کرتے ہیں اور خیر بھی۔

بینچ کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "جنید کیا تم رو رہے ہو؟ "

صادق حمید نرم طبیعت کے شخص دل جوئی کے لفظ کو ہر دکھ کا مداوا مانتے تھے۔

ان کی آواز پر بینچ پر بیٹھے شخص نے چہرہ اٹھایا تو وہ چونک چونک اٹھے۔
وہ وجود صادق صاحب کو پینتیس، چالیس کے درمیان کا لگا جسے وقت نے اپنی گرد سے لپیٹ دیا ہو۔ وہ کم عمر میں بتیری عمر کا لگنے لگا ہو۔ اور وقت انسان کو کسی بھی عمر میں بوڑھا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انگلیاں گالوں پر پھیریں۔ " میں تو نہیں رو رہا "

بینچ پر جگہ سنبھالتے کہا۔ " باخدا! جنید میری تمام عمر کا تجربہ ہے۔ جس شخص کی آنکھوں سے اکیلے میں بیٹھے پانی بہے وہ رو ہی رہا ہوتا ہے "

" میں کب روتا ہوں۔ بس کچھ یادیں آنکھیں بھگو دیتی ہیں "
جواب سن کر صادق حمید مسکرائے، گہرا مسکرائے

برجستہ جواب بھی دیا " انسان ہمیشہ کچھ یاد کر کے ہی روتا ہے "

"ویسے کیا رونے کی وجہ بتانا چاہو گے "

جنید صاحب کی خاموشی پر پھر پوچھا

یک لفظی صریح جواب " نہیں "

آنکھوں پر لگا چشمہ اتارا " ٹھیک ہے پھر کبھی بتا دینا اب تو میں یہیں پر ہوں "
اپنا رومال چشمہ صاف کرنے کو دیا۔ "تم اس اولڈ ہوم کیسے آئے "

" ٹیکسی پر آیا ہوں۔ رکشے پر بہت جمپ لگتے ہیں۔ اور میں بوڑھا ویسے ہی مریض ہوں "

صادق حمید کے الٹے جواب پر جنید صاحب نے آنکھیں گمائیں

" کتنے بچے ہیں تمہارے "
ایک اور سوال پوچھا

چشمہ صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگایا۔ انداز نارمل تھا۔ بہت نارمل "میری جائیداد کا ایک ہی وارث ہے "

" تو تم یہاں کیوں ہو "

وہی عام لہجہ " اس نے ناتا توڑ دیا۔ میں نے بھی کہا چل بندے تیرا دانہ پانی اللہ نے کہیں اور لکھ دیا ہے۔ اٹھا بوریا بستر نکل کسی اور ٹھکانے کو "

جنید صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم نارمل کیسے ہو کیا بیٹے پر غصہ نہیں آتا "

" غصہ۔۔۔ہاں غصہ تو آتا ہے۔ اسی لیے تو کہا کہ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ بس وہ میری جائیداد کا وارث تھا "

صادق حمید نے دور گملے کے پاس بیٹھے عمر کو پیچ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

دیکھا۔ جنید صاحب نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں " کیا آسان ہوتا ہے ایسے دکھ کو سہنا "

urdunovelsblog

"نہیں قطعاً آسان نہیں مگر دکھ کم کیا جا سکتا ہے اور میں وہی کرتا ہوں۔ "
آنکھیں عمر سے ہٹا کر جنید صاحب کو دیکھتے جواب دیا

" کیسے "

" راز ہے۔ مگر سن لو۔ دوسروں کی زندگی کی داستان سنتا ہوں، تاکہ خود کو بتا سکوں کہ میں نے جو درد سہا وہ دوسروں کے دکھوں کے آگے ذرہ برابر ہے "
ہنستے ہوئے لہجے میں راز بتایا۔

سوال آیا " یہ کام کرتا ہے؟"

صادق حمید کے بات مکمل کرتے ہی صائمہ وہاں پر آئی اور مطلوبہ پیغام دے کر چلی گئی۔ "ہاں! سو فیصد "

جنید صاحب اپنی نشست سے اٹھے اور آنے والے سے ملنے چل دیے۔

صادق حمید نے عمر کی طرف جاتے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مصور کی پینٹنگ سے اداسی کا عنصر غائب ہو چکا تھا۔ کیونکہ اب بینچ خالی تھا۔

****

عامر نے سامنے بیٹھے جنید صاحب کو ایک نظر دیکھا دوسری نظر ہاتھ میں پکڑے کاغذات کو۔

اشارہ کاغذات کے جانب تھا "یہ مکمل نہیں ہے کیا؟ "

بتایا۔ " نہیں "

وہ صوفے کی ٹیک چھوڑ کر بازوں گھٹنوں پر منتقل کرتا کہنے لگا۔ "! دیکھیں جنید صاحب"

" کہانیاں مکمل اچھی لگتی ہیں۔ جب تک آپ کہانی کا اختتام مجھے نہیں دیں گے۔ کہانی کو پبلش کرنا میرے لیے ممکن نہیں، کیونکہ یہ آپ کی پہلی تحریر ہے "

ہاتھ میں پکڑے کاغذات میز پر رکھتے بولا۔

" ہاں کہانیاں مکمل اچھی لگتی ہیں۔ اور یہ کہانی کچھ کچھ مکمل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ مگر پہلے کو دوسرے، تیسرے کی ضرورت نہیں وہ ان کے بنا بھی مکمل لگتا ہے۔ "
وقفہ لیا

اور میں نہیں جانتا میں اس کے اگلے حصے لکھوں گا یا نہیں۔ میں اس لکھی ہوئی کہانی کا ہی اثر باقی رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلا حصہ قربانی اور محبت کا ہے عامر ! ،دوسرا دھتکار "
خاموشی چند لمحوں کی " اور تکبر کا اور تیسرا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عامر نے پوچھا " تیسرا حصہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ "

تیسرا حصہ مکافات ہے۔۔۔۔۔ مکافات، اور میں بس محبت والا حصہ پھیلانا چاہتا ہوں۔ لوگ دوسرے حصے کا تکبر اور تیسرے کا مکافات کیسے محسوس کریں گے میں ان "
جنید صاحب نے پوری بات صریح انداز میں بتائی " کے انداز سے ڈرا ہوا ہوں

آپ نے جو کہا سن لیا میں نے، مگر میں یہاں صائمہ کے اصرار پر آیا ہوں۔اس کا کہنا ہے آپ نے احساس کو لفظوں میں بیان کیا ہے۔اور مجھے ایسا ہی لکھنے والوں کی تلاش " ۔" تھی۔اور میں یہی چاہوں گا کہ۔ باقی حصے بھی مکمل کر کے آپ مجھے دیں تا کہ میں ہی انہیں پبلش کروں
پروفیشنل انداز اپنائے ہوئے تھا۔

عامر یہ میری پہلی تحریر ہے۔ جسے میں نے دل کے تمام احساسات کو ملا کر لکھا ہے۔اور یہی میری آخری تحریر ہے۔ جس میں، میں نے اپنا تمام بچا ہوا ہنر سمیٹ دیا، اپنے " لہجہ زخمی تھا، رستے ہوئے خون سا کربناک "تجربے، پچھتاوے اور دکھ کے ساتھ۔ موت کی کچھ خبر بھی نہیں ہے۔ کب آ جائے۔ سو یہ میری پہلی اور آخری کوشش ہے زخمی۔

"ہوں۔ خیر دیکھیں گے۔ میں جانتا ہوں۔ شہرت مل گئی تو آپ کا قلم پھر کسی تحریر کا آغاز کرے گا "

عامر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تلخیہ مسکراہٹ "شہرت کی چاہ کسے ہے اب ؟ "

" اگلا وقت کس نے دیکھا ہے جنید صاحب "

جاتے جاتے عامر مصافحہ کرتے بولا۔

عامر کے جانے کے بعد کچھ لمحے سٹل بیٹھنے کے بعد جنید صاحب نے اپنے کاغذوں اور قلم کے جنڈ کو دیکھا۔ وہ دوسرا اور تیسرا حصہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر پبلشنگ کے لیے نہیں۔ بس یونہی کچھ مصروفیت درکار تھی کچھ یادوں سے رہائی کو۔

مگر یادوں سے رہائی۔

ملتی ہے کیا؟؟

اوں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کہاں کب اور کیسے بھلا۔۔۔۔۔۔

****

مجھے جائیداد کا حصہ چاہیے
مجھے ٹکڑا زمین کا پسند ہے
ماں باپ کی عزت کیسے کروں
مجھے قد کاٹ پہ گھمنڈ ہے
پلانا فرض تھا احسان تھوڑی ہے
ان سے مکمل میرا جہان تھوڑی ہے
ضرورت ہر میسر چاہیے ان کو
ان کو میرا دھیان تھوڑی ہے
میری زندگی کو میری ضرورت ہے
کیسے وقت دوں مجبوری ہے
شکوے شکایتیں ہر وقت کریں
عمر بڑھنے سے بیزار ہو گئے ہیں
مجھے نصیحت پہ نصیحت کریں
حالانکہ خود بے کار ہو گئے ہیں
میں سنبھالتا ہوں کم ہے کیا
یہ تو میرے قرض دار ہو گئے ہیں
(زینب بنت زمان)

جنید صاحب نے دوسرے حصے کے اختتام پر نظم لکھتے جونہی سر اٹھایا۔ صادق حمید کو سامنے کھڑے پایا

"اب تو رات ہو گئی جنید میاں! اس بینچ کو چھوڑ کر اندر چلو۔ بیٹھے بیٹھے تھکتے نہیں ہو کیا؟"

وہ لینے آئے تھے ان کو شاید

اپنی چیزیں سمیٹتے کہا "آ رہا ہوں میں"

چلتے ہوئے پوچھا "صائمہ بتا رہی تھی تم کچھ لکھ رہے ہو کوئی کہانی وغیرہ"

"ہاں "

ہم قدم چلتے جنید صاحب سے کہا۔ " مجھے بھی فینٹسی پسند ہے۔یہ انسان کو نئی دنیا میں لے جاتی ہے "

صاف بتایا " پھر تمہیں میری کہانی متاثر نہیں کر سکے گی "

"کیوں "

"یہ فینٹسی نہین ہے "

اب وہ کمرے کے قریب پہنچنے والے تھے۔ " تو پھر کیا حقیقت ہے "

وہی تھکا ہوا لہجہ " ہاں۔۔۔۔۔ تلخ حقیقت "

اندازا لگاتے پوچھا " کس کی زندگی پر لکھ رہے ہو "

بستر کے قریب پہنچتے کہا۔ " جس کے ہر پہلو سے واقف ہوں "

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد صادق حمید کی آواز کمرے میں گونجی

" یعنی تم اپنی زندگی پر لکھ رہے ہو "

وہ سمجھدار لگتے تھے۔یاں اچھے اندازے لگا لیتے تھے۔

صادق حمید کے جان لینے پر جنید صاحب کا دوائی تک جاتا ہاتھ لمحے کے ایک حصے تک رکا۔وہ اپنی ہی کہانی لکھ رہے تھے۔تلخ حقیقت والی محبت، تکبر اور مکافات والی۔

صادق صاحب پھر بولے

" میں ضرور پڑھوں گا۔تمہاری آنکھوں کی اداسی کا راز جاننا ہے۔آخر کون ہے جس نے تمہیں اتنا دکھ پہنچایا ہے کہ تم آنکھوں کی چمک ہی کھو بیٹھے ہو "

" ہاں کہانی کا ایک کردار ہے جس نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔اب یہ تم پر ہے کہ تم اس کردار کو جان پاتے ہو یاں نہیں "

جنید صاحب نے پانی کے گلاس کے ساتھ دوائیوں کی کرواہٹ نگلتے کہا۔

کچھ کڑواہٹیں تندرست کرتی ہیں اور کچھ بیمار۔اور بیمار کرنے والی کڑواہٹیں محض الفاظ ہی ہیں۔۔

لحاف اوڑھا " کیوں نہیں میں تو ایک بار پڑھ کر ہی جان جاوں گا "

" شب خیر "

صادق حمید نے کروٹ بدلتے کہا۔

جنید صاحب نے بھی آنکھیں بند کیں مگر وہ ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے پردے پر آ۔۔۔۔لہرایا۔

انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں وہ جانتے تھے جب تک سوچیں انہیں تھکا نہ دیں نیند ان پر مہربان نہیں ہوتی۔وہ کئی بار تصور میں جا کر ماضی بدل کر آئے تھے،روز ہی بدلتے تھے،مگر حقیقت میں قدم رکھتے تمام تصور چھن سے ٹوٹ کر بکھر جاتے تھے اور ان کی کرچیاں دل کو مزید لہولہان کرتی تھیں۔
جنید صاحب کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑائے۔

urdunovelsblog

" بستر پر لیٹتے ہی سو جانے والے لوگ خوش قسمتی کی انتہا پر ہوتے ہیں جنید۔اور تم تو خیر ذرا بھی خوش قسمت نہیں "

****

معمول کے مطابق وہی بینچ تھا اور وہی وجود،مگر صبح نئی تھی اور نئی تاریخ۔ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے پیتے جنید صاحب اپنے اندر ایک خلا کو جگہ بناتے محسوس کر رہے تھے۔فجر کے بعد سے ہی حالت عجیب تھی۔

خالی خالی،بے سکون،نا سمجھ میں آنے والی،نا جانے ہوا کیا تھا الجھن تھی جو بڑھ رہی تھی سب ثانوی لگ رہا تھا اور جو اول لگتا تھا وہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔اول کا درجہ ذہن میں خالی تھا،خالی دماغ،خالی دل،خالی لگتا جسم کا ہر اعضاء کس چیز کا اندیشہ تھے؟
کیا انڈیکیٹ کر رہے تھے؟۔

پتا نہیں
خبر نہیں
سمجھ نہیں
بوجھ نہیں

جنید صاحب نے محسوس کیا آج اس بینچ پر بھی سکون نہیں تھا۔ کوئی پرانی یاد بھی آنکھوں میں نہیں چل رہی تھی۔

ہاتھ میں تھاما کپ ساتھ بینچ پر رکھتے سامنے دیکھا جہاں صادق حمید کے سنگ باقی سب بوڑھوں کی ٹولی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

ان کو دیکھتے ایک آواز کانوں میں پڑی، چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ آنکھوں نے دیکھا تو کپ میز کی بجائے زمین پر لینڈ ہوا تھا۔

کپ کی کرچیوں کا منظر دھندلانے لگا، خالی ذہن بند ہونے لگا، تمام صلاحیتیں مفلوج ہونے لگیں سب تمام ہو رہا تھا۔

اختتام ہو رہا تھا۔ آخری نظارے، آخری سانسیں سب کچھ آخری آخری لگ رہا تھا۔

اور پھر آنکھیں بند ہونے سے پہلے انہیں کچھ آوازیں سنائی دیں
مگر اصل الفاظ نہ سن سکے، چہرے دھندلانے ہوئے اصلی بصارت نہ چن سکے۔

urdunovelsblog

پھر بند ہو گئیں آنکھیں،
اندھیرا چھا گیا،
سب جامد ہو گیا،
مفلوج،
کچھ باقی نہیں رہا،
نہ دکھ،
نہ پریشانی،
نہ منظر کو اداس کرتیں
وہ اداس بوڑھی آنکھیں
کہانی کا کردار اپنے اختتام کو جا پہنچا۔

****

صادق حمید نے مٹھی کھول دی اور بورے رنگ کی داڑھ دیکھنے لگے۔ ایک لمحہ تھا کہ اس کا بھی کچھ حصہ مٹھی خالی ہوگئی۔ مٹی مٹی سے جا ملی، خاک خاک میں گھل گئی۔ صادق حمید نے سامنے لگی تختی کو دیکھا اور کہنے لگے

" تم نے مجھے سکھایا کہ زندگی واقعتاً ہاتھ سے پھسلتی مٹی کی مانند ہے۔ بہت جلد ہی مٹھی خالی ہو جاتی۔ وقت گزر جاتا ہے اور اپنے ساتھ آپ کی زندگی بھی لے جاتا ہے "

صادق حمید نے آنکھوں میں چبھتے سیال کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔ مگر ایک اور قطار تھی جو آنکھوں سے رواں ہوگئی۔ خود سوکھ جانے پر ہی تھمنی تھی آنسوؤں کی پے در پے گال سے ہو کر گریبان نم کرتی نمی۔

صادق حمید کے گہرا سانس ہوا کے سپرد کرنے پر گلے میں ابھرتی گلٹی کرب کی انتہا کر گئی۔ پھولوں کو مٹی پر بکھیرے لگے تو مٹی پر بکھرے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے ہوا میں پھیل کر دیکھا۔

کہ آخر نظارہ ہے کیا؟

منظر کیا دیکھاتا ہے؟

کا نام لکھا تھا۔ اور قبر کی مٹی گواہی دے رہی تھی کہ ابھی ابھی اسے قبر کی شکل میں سنوارا گیا ہے۔ " جنید اقبال " اور خوشبو کو قبر نظر آئی جس کی تختی پر

صادق حمید اٹھ کھڑے ہوئے اور باقی جنازیوں کے ہمراہ مرنے والے کے لیے فاتحہ پڑھنے لگے۔

۔ صادق حمید کو یاد تھا پچھلے چند ہفتے کتنے اچھے سے گزرے تھے ان کے جنید صاحب کے ساتھ ادھر ادھر کے تمام قصے وہ جنید صاحب کو سناتے چلے گئے تھے۔ کہ کسی قصے کی بدولت ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔
یاں تو ان کے قصوں میں اثر نہ تھا۔
یاں وہ اداسی ختم ہونے والی نہ تھی۔
اور ہاں
اداسی ہی ختم ہونے والے نہ تھی۔
یونہی آنکھیں موت کی نیند میں ڈوب گئیں۔

urdunovelsblog

بنا چمکے اداسی کے سنگ۔

اولڈ ہوم میں اداس آنکھوں نے بند ہو کر سماں سوگوار کر دیا تھا۔ماننے والے کی تمام باتیں، یادیں سب کے ذہنوں کے پردے پر گونجنے لگیں۔صادق صاحب نے پھر مٹی کی قبر پر ہاتھ پیرا اور سب کے ساتھ واپس چل دیے۔
مرنے والا اکیلا جاتا ہے۔

وہ اپنے اپنوں کی مسکراہٹیں، محبتیں، زندگی کی رونقیں لے کر نہیں جاتا بس چھپا جاتا ہے۔جو اس کے پیچھے سے آہستہ آہستہ زندہ لوگ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔اور وہی زندگی کی روٹین سائیکل دوبارہ چلنے لگتی ہے۔

صادق حمید نے مڑ کر قبر کو دیکھا۔وہ حیران تھے کہ جنید صاحب کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔کیا ان کے گھر میں کوئی نہیں تھا یاں گھر والوں کے لیے وہ کوئی نہیں تھے۔

****

صادق حمید نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو دیکھا۔انہوں نے اس میں لکھے دونوں باب مکمل کر لیے تھے۔جنید صاحب کی کہانی انہوں نے جان لی تھی۔
مگر کتاب میں کرداروں کے نام مختلف تھے، کچھ اور تھے۔

کہانی کا پہلا باب ایک فیملی کا تھا۔ماں باپ اور بیٹا۔ماں کا صرف نام تھا وہ کہانی کا کردار نہیں تھی۔آغاز ہی اس کے مرنے اور ایک ننھے وجود کے زندگی پانے سے ہوا تھا۔پہلا حصہ اس باپ کی کہانی تھی جس نے بیوی کے مرنے کا غم اور بیٹے کے آنے کی خوشی ایک ساتھ دیکھی تھی۔اس نے خود کو ساتھی کے غم سے اپنے وارث کو پالنے کے لیے باہر نکالا تھا۔اپنے بیٹے کے لیے ماں اور باپ دونوں بننے کی اس نے جان توڑ کوشش کی۔گھر کے کاموں اور کفالت کی ذمہ داری کو سنگ سنگ نبھایا۔دوسری شادی بھی نہ کی صرف توجہ اپنے وارث اپنے لخت جگر کو دی۔کہانی گزرتی رہی اور اس نے کرداروں کی عمر مین اضافہ کر دیا۔بچے نے چلنا شروع کیا، شرارتیں کرنے لگا۔کہیں وہ اپنے باپ کے آگے آگے چلتا مستی سے کچھ کہہ رہا تھا، تو کہیں اس کے سینے پر لیٹا اس کے چہرے کو رنگوں سے سجا رہا تھا، کہیں اس کے باپ نے اسے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔تو کہیں وہ اس کے بیمار ہونے پر اسے سینے سے لگائے رات بھر اس کے آرام کے لیے جاگ رہا تھا۔کہیں بچہ رو رہا تھا اور باپ سے ماں کے متعلق پوچھتے اسے حیران کر رہا تھا۔کہیں اپنے باپ کو زندگی کہہ رہا تھا اور اپنے نخرے اٹھوا رہا تھا۔

باپ نے بیٹے کو پروان چڑھا کر فرض نبھایا۔کہانی کا پہلا حصہ محبت کے نام سے تھا۔باپ اور بیٹے کے محبت۔اور پہلا باپ مکمل ہو گیا۔

صادق حمید نے پہلے باب کے اختتام پر سوچا کہ جنید کا کوئی بیٹا بھی تھا؟ اگر ہاں تو وہ اس کے جنازے پر کیوں نہیں آیا۔

اس کا جواب انہیں معلوم تھا کہ اگلا باب انہیں دے دے گا۔اگلے باب کا آغاز کیا۔جس کا نام تھا تکبر۔

اگلے باب میں جوانی کا نشہ تھا۔اختیار کا گھمنڈ تھا۔اس نشے اور گھمنڈ کے اثر نے پرورش کو مانند کر دیا۔ نفی صحبتوں نے پرورش کے رنگ پر اپنا رنگ اوڑھا دیا۔ باپ کی تمام عمر کی ریاضت فنا ہو گئی۔ بیٹے نے سب سے پہلے خود پر عائد پابندیوں کا گلہ کیا۔اور خود کو ان پابندیوں سے آزاد کروا کر اپنی مرضی کی چادر اوڑھ لی۔اپنے تمام فیصلے خود کرنے لگا۔ جائیداد کا کارڈ پلے کر کے جائیداد اپنے نام کروا کے۔ پسند کی شادی کر کے باپ کو اولڈ ایج ہوم بیجھا دیا۔

بیجھنے سے پہلے یہی کہا کہ اب وہ ان کی صحیح سے خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بہت مصروف ہے اپنے بیوی، بیٹے اور کاروبار میں۔ باپ کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا ۔اولڈ ایج والے ان کو بہتر سنبھال سکتے ہیں

دوسرے باب کی آخری سطر تھی کہ محبتوں کو تکبر کی دیمک نگل جاتی ہے۔ محبت کو تکبر مار دیتا ہے۔

صادق حمید نے سوچا کہ جنید صاحب کے بیٹے نے ان کے ساتھ وہی سلوک برتا جو ان کے اپنے بیٹے نے ان کے ساتھ برتا تھا۔ مگر فرق تھا۔ وہ خود چھوڑ کر آ گئے تھے اپنے وارث کو اس کی سکون کی زندگی میں۔اور جنید صاحب اپنے بیٹے کو چھوڑنے پر بھی نا چھوڑ سکے۔ وہ ان کی اداسی بن کر آخری وقت تک ان کے ساتھ رہا۔

urdunovelsblog

تجھے جائیداد کا حصہ چاہیے
تجھے ٹکڑا زمین کا پسند ہے
تو ماں باپ کی عزت کیسے کرے
تجھے قد کاٹ پر گھمنڈ ہے
پلانا فرض تھا کیا احسان تھوڑی ہے
ہم سے مکمل تیرا جہان تھوڑی ہے
ضرورت ہر میسر چاہیے ہم کو
عمر بھر کیا تیرا دھیان تھوڑی ہے
فرصت نہیں مجبور ہے تو
تو ہماری محبت کا قدردان تھوڑی ہے
شکوے، شکایتیں ہر وقت کرتے ہیں
گزرتی عمر نے ہم کو بیزار کر دیا ہے
نصیحت اس لیے کہ سایہ دیرپا نہیں ہمارا
وقت نے ہم کو بھی بے کار کر دیا ہے
تیرا سنبھالنا کم نہیں لخت جگر
تو نے تو اپنا قرض دار کر دیا ہے
محبت ہے مگر بتا کر نہیں مرنا

کہ تواولاد ہے ہم راز تھوڑی ہے

(زینب بنت زمان)

****

صادق حمید آج کئی مہینوں بعد جنید صاحب کی قبر پر آئے تھے۔ابھی وہ چند قدم دور تھے انہیں قبر پر ایک جوان بیٹھا نظر آیا۔ پاس ہی صائمہ کھڑی تھی۔اندازہ لگایاوہ جنید صاحب کا بیٹا ہو گا۔ جسے اب فرصت ملی باپ کی قبر پر آنے کی۔

اس کے سر پہنچ کر کہنے لگے۔

" جس شخص نے اپنی تمام عمر تمہارے لیے صرف کر دی۔ جس نے تمہارے سکون کو کئی قربانیاں دیں اس باپ کی قبر پر آنے کی فرصت اب نصیب ہوئی ہے تمہیں۔ جانتے ہو برخردار! جب وہ زندہ تھا اسے تب تمہاری ضرورت تھی۔ جب وہ مرا اسے تب تمہارے کندھے کی ضرورت تھی۔اسے ہر موڑ پر تمہاری ضرورت تھی۔ مگر جس طرح وہ تمہارے بچپن سے لے کر جوانی تک تمہاری ہر ضرورت تمہاری خواہشات سمیت پوری کرتا رہا تاکہ تم اس کے بڑھاپے کا سہارا اور اس کی میت کا کندھا بن سکو وہ اس کا کیا سب رائیگاں گیا۔ کیونکہ اس کے نصیب میں تم سی اولاد آئی، ناشکری، نافرمانی اور بے حس۔ "

وہ بولنے پر آئے تو تمام تلخیاں بیان کر گئے۔

نوجوان نے صادق حمید کو حیرانگی سے دیکھا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد صائمہ سے مخاطب ہوا

"میں چلتا ہوں صائمہ۔ قبرستان تک لانے کا شکریہ "

کہہ کر بنا صادق حمید کی جانب دیکھے وہاں سے چلا گیا۔

صادق حمید نے غصے سے اس کی پیٹھ کو گھورا اور ہاتھ میں پکڑا عمر کا دیا پھول پتی پتی کر کے قبر پر ڈالنے لگے۔

صائمہ نے انہیں دیکھا اور کہا

" آپ نے علی کو اتنی باتیں کیوں سنا دیں "

urdunovelsblog

انہوں نے گہرا سانس لیا اور بولے

" جنید کے بیٹے پر مجھے بہت غصہ ہے۔ اتنا تو شاید اپنے بیٹے پر نہیں۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ وہ میرے جنازے کو کندھا تو ضرور دے گا "

اس نے وضاحت دی " مگر وہ جنید صاحب کا بیٹا نہین تھا "

حیرانگی تھی۔ اور بلاوجہ اتنی باتیں بھی تو سنادیں تھیں۔ "تو پھر کون تھا؟ "

" آپ فاتح پڑھ لیں۔ واپس چل کر بات کرتے ہیں "

فاتح پڑھ کر باہر چل دیے۔

پوچھا۔ " وہ کون تھا صائمہ بیٹا "

بتایا "وہ علی تھا۔ جنید صاحب نے اس کی بچپن سے اب تک کی پڑھائی کا تمام خرچہ اٹھایا تھا۔ اس لیے وہ اپنے محسن کی قبر پر آیا تھا "

شرمندہ نظر آتے تھے۔ " اور مجھے لگا وہ جنید کا بیٹا تھا۔ اس لیے میں وہ سب بول گیا "

urdunovelsblog

" مگر جنید صاحب کا بیٹا تو کافی برس پہلے ہی اپنی ماں کے ساتھ ایکسیڈینٹ میں مر گیا تھا "

صائمہ کے کہنے پر صادق حمید نے صدمے کے ساتھ اسے دیکھا۔ اگر جنید کا بیٹا مر گیا تھا تو پھر کہانی میں وارث کون تھا۔

اس کے پوچھنے پر انہوں نے آہستہ آواز میں کہا۔ " انکل کیا سوچ رہے ہیں آپ "

جنید نے مجھے کہا تھا کہ اس کی لکھی کہانی اس کی اپنی ہے۔ اگر اس کا بیٹا مر گیا تھا تو پھر کہانی میں جو بیٹا تھا وہ کون ہے۔ یاں پھر کہانی میں جنید نے کچھ حقیقت لکھی ہو بس۔ " باقی سب خیالی ہو"

صائمہ نے بتایا۔ "کہانی حقیقت تھی انکل۔ کہانی ساری سچی تھی "

" میں نے پہلی بار جب اسے پڑھا تھا میں بھی آپ کی طرح کنفیوز ہوئی تھی۔ مگر پھر میں نے جنید انکل سے پوچھا تو مجھے پتا چلا میں نے ان کا کردار کہانی میں غلط تصور کیا تھا "

وہ الجھے "مطلب "

پوچھا " پہلے بتائیں آپ نے بھی ان کو باپ کے کردار پر تصور کیا تھا "

"ہاں "

وہ ہلکا سا ہنسی اور رکی "میری بھی یہی غلطی تھی۔۔۔۔ "

" وہ باپ کا کردار نہیں تھے "

" تو پھر "

" وہ بیٹے تھے جنہوں نے باپ کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ کہانی کے اصل ولن تھے۔ وہ باپ اور بیٹے کے رشتے کو ختم کرنے والے تھے "

صادق حمید کو گہرا صدمہ پہنچا انہیں لگا غلط سنا ہے انہوں نے۔ مگر صائمہ نے پھر اپنی بات دہرائی تو انہیں معلوم ہوا کہ کہانی کے کردار الٹے تھے۔ جنید باپ نہیں تھا وہ بیٹا تھا۔ وہ مظلوم نہیں ظالم تھا۔ حیرانگی ہی حیرانگی تھی۔ صادق حمید کو جنید صاحب کی وہ بات یاد آئی جو ایک رات انہوں نے کہی تھی۔

urdunovelsblog

" ہاں کہانی کا ایک کردار ہے۔ جس نے مجھے کھوکھلا کر دیا اب یہ تم پر ہے کہ تم اس کردار جان پاتے ہو یاں نہیں "

وہ بڑبڑائے اور صائمہ کی بات پر اسے دیکھا " یعنی جنید نے خود کو خود ہی کھوکھلا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی کی وجہ وہ خود تھا "

تیسرا حصہ بھی ہے کہانی کا۔ اپنے بابا کو گھر سے نکالنے کے بعد وہ معمول پر آ گئے۔ مگر تقدیر کی سائیکل میں مکافات کے حملے سے وہ ڈھے گئے۔ بیوی اور بیٹا مر گئے۔ تو باقی "
" کیا رہا۔ تکبر کا باب مکافات کے وار سے ختم ہو گیا
" پھر باپ کو ڈھونڈنے نکلے تو فقط قبر ملی "
وہ سانس لینے رکی

جس بینچ پر وہ دن گزارتے تھے ان کے والد نے بھی عمر کا آخری حصہ وہاں گزارا تھا صادق انکل۔ مجھ سے پہلے میرے بابا سنبھالتے تھے اولڈ ہوم۔ جنید انکل کے والد بھی "
"تب ہی تھے۔ اس لیے انہیں اولڈ ہوم کے اس کونے سے لگاؤ تھا۔

" ان کی جائیداد ان کے کچھ کام نا آئی تو انہوں نے اسے مختلف بچوں کی تعلیم میں لگا دیا "

وہ کہہ کر اٹھی اور چلی گئی۔ صادق حمید نے اس کونے کو دیکھا جو خالی تھا۔ اداس مجسمہ اب وہاں نہیں تھا۔ اب مصور کا شاہکار اپنے نقش کھو بیٹھا تھا۔ کہانی کا اینگل سیدھا ہوا تو سب بدل گیا۔ درست کہانیاں درست پیغامات دے جاتی ہیں۔

اور محبتوں کو تکبر کی دیمک نگل جائے تو پھر بھی وہ سدا نہیں رہتا مکافات کا حملہ سب ڈھا دیتا ہے۔

****

☆

urdunovelsblog